پاکستان کے معاشرتی و سیاسی نظام میں

اسلامی قانون کا منصب و مقام

(جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس، سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان)

پاکستان کی سیاسی و معاشی و معاشرتی تنظیم میں اسلامی قانون کے کردار کو بیان کرنے کے لیے بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اسلامی قانون کا نفاذ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کا موجب ہو گا۔ اس کے بعد ہمیں صرف اس امر کا تعین کرنا ہو گا کہ اسلامی ریاست کے مفہوم میں کیا کچھ شامل ہے اور اس کے مضمرات کیا ہیں۔

مقصدِ حیات یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا لازمی نتیجہ اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ اسلامی قانون یا دوسرے الفاظ میں قانونِ شریعت انسانی کردار کے لیے محض چند اخلاقی اصول ضوابط بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ سب سے پہلے انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے اور وہ ہے خدا کی اطاعت۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات۔ ۵۶) "میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔ انسان کے ماسوا کائنات کی جملہ مخلوق ہر حال میں خدا کی اطاعت اور بندگی بجا لاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ انسان کو ایک محدود دائرے کے اندر آزادیٔ عمل عطا کی گئی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس دائرے میں انسان اپنی آزاد مرضی سے اس کی اطاعت کرے۔

اسلامی ریاست کا قیام ایک دینی فریضہ مقصدِ حیات کے تعین کے بعد شریعتِ الٰہی اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک مثالی اجتماعی نظام برپا کرتی ہے۔ اس کے لیے وہ ایسے اصولوں اور ایسے دیوانی، تعزیراتی اور مالی قوانین کا ایک ڈھانچہ قائم کرتی ہے جو قابلِ ترمیم و تنسیخ نہیں ہیں۔ اس ڈھانچے کے حدود

میں رہتے ہوئے انسانی ذہن اپنے حالات کے مطابق قواعد و قوانین وضع کر سکتا ہے۔ یہ شریعت مسلمانوں پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور پھر ان امرائے ریاست کی اطاعت واجب قرار دیتی ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں، بشرطیکہ اُن کی اطاعت سے اللہ و رسول کی نافرمانی لازم نہ آئے۔ قرآن مجید یہ طے کرتا ہے کہ مسلمان وہ لوگ ہیں:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج - ۴۱)	جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام لازم و ناگزیر ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن۔	اللہ تعالیٰ ریاست کے زور سے ان چیزوں کی روک تھام کرتا ہے جن کا سدِّباب محض قرآن کے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی رُو سے حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام - ۵۸)	حکم کا اختیار صرف اللہ کے لیے ہے
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ (آل عمران - ۱۵۴)	کہتے ہیں، کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہہ دو، امر و اقتدار درحقیقت سارا کا سارا اللہ کے لیے ہے۔

اسی طرح کا مضمون سورۂ یوسف، ۵۶-الانعام، ۵۷-الاعراف، ۵۴-اور النحل، ۱۱۶ میں بھی بیان ہوا ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا تھا کہ اللہ کی جس حاکمیت کا ذکر ان آیات میں ہے اس سے مراد اللہ کے وہ تکوینی قوانین ہیں جو کائنات میں کارفرما ہیں۔ لیکن اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں دیوانی، فوجداری اور مالی قوانین کا ذکر موجود ہے اور قرآن میں ایسی آیات بھی پائی جاتی ہیں جن میں حکمرانوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق کریں۔ اس کا

صاف مطلب یہ ہے کہ حاکمیتِ الٰہی کا واضح اور براہِ راست تعلق ریاست وسیاست سے بھی ہے۔ سورۂ مائدہ میں بعض تعزیری قوانین بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴-۴۵-۴۷)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں، ... وہی ظالم ہیں ... وہی فاسق ہیں۔

قرآن مجید بار بار اُن افراد کو مخاطب کرتا ہے جنہیں ریاست میں اقتدار حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی بالعموم اِس مفروضہ مسلّمہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک ریاست موجود ہو گی جس میں شریعت نافذ العمل ہو گی۔ اللہ نے اپنے رسول کو ایک ریاست کے قیام کا مکلف بنایا تھا اور آپ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ امیر وحکمران بھی تھے۔

اوپر کی بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک مسلم معاشرے کی معمولی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے اندر احکامِ شریعت کو بالکلیہ جاری کرے اور عملی جامہ پہنائے۔ اس لحاظ سے جہاں مسلمانوں کو آزادی واقتدار حاصل ہو وہاں اسلامی ریاست برپا کرنا اُن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں سے یہ چاہنا کہ وہ اسلامی ریاست قائم کرنے سے باز رہیں، دوسرے لفظوں میں گویا اُن سے یہ چاہنا ہے کہ وہ مسلمان بن کر نہ رہیں۔ اس معاملہ میں کسی بحث کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بلاشبہ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ایک لادینی (سیکولر) ریاست راتوں رات ایک اسلامی ریاست میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تبدیلی کے لیے بہرحال تدریج ناگزیر ہے، ورنہ سماجی زندگی درہم برہم ہو جانے کا خدشہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسلامی ریاست کے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کئی سال لگ گئے تھے۔

اسلامی ریاست کے بنیادی تصورات | اسلامی ریاست کے لزوم ووجوب کو واضح کرنے کے بعد اب ہم اس مسئلے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کے مضمرات کیا ہیں۔ جن بنیادی تصورات پر یہ ریاست قائم ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

(۱) حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ انسانی کردار کی صحت کا معیار یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے

مطابق ہو، اور اللہ کی رضا کے معلوم کرنے کا ذریعہ اسلامی شریعت ہے۔

(۲) انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔

(۳) اسلامی ریاست کے وجود کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ وہ زندگی کے مقصدِ حقیقی کو پہنچنے میں مددگار رہو، اور وہ مقصد ہے اللہ کی عبودیت اور اطاعت۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور امرائے ریاست اطاعت فی المعروف کے حقدار ہیں

(۵) معاملات کے فیصلے باہمی مشورے سے ہونے چاہییں، اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (وہ مسائل کو مشورے سے طے کرتے ہیں) الشوریٰ، ۳۸۔

(۶) وسیع تر انسانی برادری کے اندر مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اسلامی ریاست اور لادینی ریاست کا فرق | اسلامی ریاست اور لادینی (سیکولر) ریاست ایک دوسری سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنا کہ اسلامی طرزِ حیات مغرب کے طرزِ حیات سے مختلف ہے۔ سیکولر ریاست درحقیقت مغربی تہذیب کا ثمرہ ہے اور مغربی تہذیب سے میری مراد ایسا طرزِ زندگی نہیں ہے جو دینِ مسیحی پر مبنی ہو کیونکہ مغربی تہذیب کی اساس مذہبی تعلیمات پر نہیں رکھی گئی ہے! اسلامی طرزِ حیات اور مغربی طرزِ حیات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کا مطلب خدا کی بندگی ہے اور دوسرے کا مطلب خواہش کی بندگی۔ ہمارا الٰہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور تہذیبِ حاضر کے پرستار اس ارشادِ الٰہی کے مصداق ہیں:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (الجاثیہ: ۲۳)	کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہی میں پھینک دیا ہے۔

مغربی تہذیب کی رُو سے انسانی مساعی کا مدعا مادہ پرستانہ مقاصد کا حصول اور خواہشات کی تسکین ہے۔ اس تہذیب میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدر بس یہی ہے۔ جن اخلاقی ضوابط کو یہ تہذیب تسلیم کرتی ہے ان میں خواہشاتِ نفس سے بالاتر کسی شئے کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس کے تمام تر قواعد

ضوابط خواہشِ نفس کی تکمیل ہی کے لیے ہیں۔ یہ قواعد ایسے ہیں جن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خواہشات کی تحصیل میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ کامیابی سے ہم کنار کریں گے۔

اسلامی ریاست کے تصور کے خلاف بار بار یہ الزام لگا کر حملے کیے جاتے ہیں کہ یہ رجعت پسندانہ تھیا کریسی ہے جو قرونِ وسطیٰ کی یادگار ہے اور اس میں شہریوں کے درمیان مذہب پر مبنی ایک ناروا امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معترض حضرات سیکولرزم کو ریاست کے عزوشرف کی ایک علامت قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ایک شخص اسلامی ریاست اور سیکولر اسٹیٹ کے اساسی نظریات کا تقابل کرتا ہے تو وہ اس طرح کے حملوں پر اظہارِ حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تہذیبِ جدید کی تہ میں جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے اور جس تصور سے یہ تہذیب وجود میں آئی ہے اسے میں ابھی ابھی بیان کر چکا ہوں۔ مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کو جب مذہب اور روایتی متوارث خلاقیات سے منقطع اور علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو عمل کے لیے کوئی اعلیٰ و ارفع محرک باقی نہیں رہتا۔ اس تہذیب نے انسانی کارزشتہ اُس خدا سے تو کاٹ دیا جو اس کے لیے خیر و شر کا معیار مقرر کرتا تھا مگر وہ اس کا کوئی بدل فراہم نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ سفینۂ حیات کے لیے کوئی لنگر باقی نہ رہا۔ جن فلسفیانہ اور نفسیاتی نظریات کا اس تہذیب پر بڑا تسلط ہے، اُنھوں نے ہر اس بنیاد کو منہدم کر دیا ہے جو انسان کو اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کا لحاظ کر کے ضبطِ نفس پر آمادہ کر سکتی تھی۔ ان نظریات کی رُو سے زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ انسان محض کسی اتفاقی حادثے کی پیداوار ہے، جو عین ممکن ہے کہ کبھی ظہور پذیر ہی نہ ہوتا۔

نفسیات میں سُلوکیت (BEHAVIORISM) اور تحلیل نفسی (PSYCHO-ANALYSIS) کی رُو سے انسان اپنے افعال کا سرے سے ذمہ دار ہی نہیں ہے۔ ایک کے نزدیک انسانی افعال محض طبیعی محرکات کے اضطراری ردعمل ہیں اور دوسرے کے نزدیک وہ انسانی ذہن کی بعض ایسی نیم شعوری یا غیر شعوری کیفیات کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار اور قدرت حاصل نہیں ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں، تحلیل نفسی کا فن ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ وہ نفسانی خواہشات کی تسکین کو صرف جائز اور حق بجانب ہی قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ یہ سبق بھی پڑھاتا ہے کہ ہر خواہش کی تسکین واجب اور ناگزیر ہے، کیونکہ اگر اس کی تسکین

نہ کی گئی تو انسان کے ذہن میں الجھنیں (COMPLEXES) پڑ جاتی ہیں اور وہ ایک غیر صحت مندانہ کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان نظریات کی روشنی میں بہترین بشری اوصاف مثلاً شجاعت، شرافت، حیاداری، مروت، ایثار اور طہارتِ افکار، سب کے سب اپنی اہمیت و معنویت کھو دیتے ہیں، کیونکہ وہ بعض طبعی اور نفسیاتی عوامل کا ایک اضطراری ثمرہ قرار پاتے ہیں، جن میں انسانی کوشش کو دخل نہیں۔

اس طرح کے فلسفۂ زندگی کا جو اثر انسانی سیرت و کردار پر مترتب ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ریاست کے معاملات کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ ریاست کی کسی کارروائی کے لیے بس قومی مفاد ہی ایک معیارِ صحت ہے۔ ریاست کے اقتدار و اختیار پر کوئی حد بندی تسلیم نہیں کی جا سکتی حتیٰ کہ وہ کسی عہد و پیمان کی بھی پابند نہیں ہے کیونکہ وہ بالاتر حاکمیت کی حامل ہے اور اس کے حدودِ کار پر کوئی رکاوٹ عائد ہونا حاکمیت کے منافی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ان کے کردار کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جو شے انسان کے لیے خوش کن اور مسرت انگیز ہے وہی خیر اور وہی نیکی ہے، تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے انسان کی مسرت میں خلل انداز نہ ہو۔ گناہ و صواب کی تمیز اور روایتی تصورِ اخلاق کو خیرباد کہا جا چکا ہے اور اخلاق میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ صرف منفعت پرستانہ تصورِ اخلاق ہے۔ ایک آدمی کو بس ذرا اس امر کا لحاظ کرنا ہو گا کہ اس کی خوشی کسی دوسرے کی شادمانی میں خلل نہ ڈالے۔ اس پر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تناقض فی الاصطلاحات (CONTRADICTION IN TERMS) نہیں ہے کہ ایک طرف لطف و لذت کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدر قرار دیا جائے اور دوسری طرف آپ سے یہ توقع بھی رکھی جائے کہ آپ دوسروں کی خاطر ایک ایسے قاعدے کی پابندی کریں جو اپنی خوشی سے دست بردار ہو جانے کا آپ سے مطالبہ کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسانوں کی خاطر اپنے سرور سے صرف اسی صورت میں دستبردار ہو سکتا ہے جبکہ یہ دستبرداری اس کے نزدیک خود اس کی اپنی ذاتی مسرت سے بلند تر قدر و منزلت کی حامل ہو، مگر آپ کے فلسفے نے تو اس کے لیے اس کی اپنی ہی خواہشات کی تسکین کو بلند ترین قدر بنا دیا ہے۔ جب تک اخلاقی اقدار کو بجائے خود زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار تسلیم نہ کیا جائے، اس وقت تک دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف

کا دور دورہ نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کا فہم و ادراک انسان کے لیے دشوار نہیں ہے۔ لیکن جو شیطان انسان کے باطن پر اثر انداز ہے وہ انسان کو سوچنے کی مہلت نہیں دیتا۔ یہ نظریہ بھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے کہ خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جانا واقعی انسان کو راحت و مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ انسان کو حقیقی سرور و اطمینان تو صرف اُس جد و جہد کے طفیل ہی حاصل ہوتا ہے جو وہ نیکی کے سرانجام دینے میں صرف کرتا ہے۔ یہ جد و جہد جتنی سخت ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں اتنی ہی زیادہ راحت و طمانیت نصیب ہوتی ہے۔ مغربی فلاسفی کا مفروضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی اخلاقی جد و جہد کے بغیر تنہا انسانی ذہانت اور غور و فکر کے بل پر ایسا معاشرہ وجود میں لایا جا سکتا ہے جس میں معقولیت اور انصاف کو غلبہ حاصل ہو۔ یہ مفروضہ اُس شیطان کو نظر انداز کر کے قائم کیا گیا ہے جو انسان کے اندر چھپا بیٹھا ہے، جس پر فتح پانے کے لیے نہایت سنجیدہ اور شدید کشمکش کی حاجت ہے، اور درحقیقت اس کشمکش کے باوجود وہ شیطان پوری طرح مغلوب نہیں ہو سکتا۔ حق کی راہ نہایت کٹھن اور دشوار ہے۔ اس کی منزل اتنی بلند اور بعید ہے کہ وہ آخر وقت تک ایک مطمحِ نظر ہی رہتی ہے جس کے منتہا کو نہیں پایا جا سکتا۔ محض عقل و ذہانت کے بل پر اس مسئلے کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سخت ضبط و تحمل، بے نفسی اور ایثار اس کے لیے درکار ہے اور زندگی کا مادہ پرستانہ نظریہ اتنا بودا ہے کہ وہ اس صبر آزما مہم کے لیے کوئی مستحکم بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔ اتنی عظیم قربانی پیش کرنے کے لیے ایک زبردست محرک درکار ہے اور اس قربانی کے بغیر دنیا میں قیامِ عدل ممکن نہیں ہے۔ یہ محرک صرف ایمان باللہ ہی میں پایا جاتا ہے۔

اسلامی ریاست ایک مثالی ریاست | اسلامی ریاست ہمارے لیے ایک مثالی ریاست ہے۔ اس کا اولین مقصد ہی اپنے شہریوں کے اندر خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، موجودہ زندگی اس کے لیے محض تیاری اور زادِ سفر ہے۔ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست بھی ہے، مگر اس میں روحانی و اخلاقی مقاصد کو مادّی مقاصد پر بالادستی حاصل ہے۔ یہ ریاست وسیع تر انسانی برادری کے مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حدود کے اندر اسلامی اخوت کا ایک دائرہ تشکیل کرتی ہے۔ یہ اغنیاء سے مال لے کر فقراء کی طرف لوٹاتی ہے اور اس طرح دولت کی منصفانہ تقسیم کرتی ہے۔ ایک ایسی ریاست جس کی

دنیا و اطاعتِ الٰہی اور آخرت کے لیے خیر کی کمائی پر رکھی گئی ہو، وہ اعمالِ صالحہ کے لیے ایک بہترین محرک فراہم کرتی ہے اور جذبہ و عمل کی یہی صالحیت ریاستِ اسلامی کے جواز و استحسان کے لیے دلیل مہیا کرتی ہے۔ اس طرح کی ایک ریاست اپنے اصولوں کے پیشِ نظر نہ بین الاقوامی تعلقات میں اخلاق اور خوش معاملگی کا دامن چھوڑ سکتی ہے، نہ خود اپنے شہریوں سے کسی قسم کی بے انصافی برت سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی اعتراض ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے خلاف پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ممکن اس نام سے جو ریاست قائم کی جائے گی وہ صحیح معنوں میں اسلامی نہیں ہو گی اور اس کے بنیادی تصورات پر عملدرآمد نہ ہو گا۔ میں بھی مانتا ہوں کہ اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کا عمل بہت دشوار ہے اور اس راہ میں بڑی مشکلات حائل ہیں۔ بہت سے مسلمان ایسے موجود ہیں جن کو اس کا قیام گوارا نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی خواہشات و مرضیات کے موافق نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا مطالبہ ہم سب سے لازماً یہ ہو گا کہ ہم سچے مسلمان بن کر رہیں، اور ظاہر ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں ہیں۔ میں نے اہلِ مغرب کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا بہت بڑی حد تک اطلاق آج کل کے مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ تہذیبِ حاضر کا بس ایک سستا ایڈیشن ہیں۔ آج اگر ہم انسانیت کو دو طبقوں میں منقسم کر دیں، ایک وہ جو خدا کے بندے ہیں اور دوسرے وہ جو بندگانِ نفس ہیں، تو اس زمانے کے مسلمانوں کا شمار علی العموم دوسرے ہی طبقے میں ہو گا۔

اسلامی ریاست کا طریقِ کار اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست کام کس طرح کرتی ہے۔ اپنے بنیادی تصورات کی ٹھیک مطابقت میں یہ ریاست حسبِ ذیل طریقوں پر چلتی ہے جنہیں اسلام کے سیاسی نظریہ اور اصولِ قانون نے تسلیم کیا ہے:

(۱) مقننہ اپنی قانون سازی میں حدودِ شرعیہ کی پابند ہو گی۔ وہ کوئی ایسا قانون بنانے کی مجاز نہ ہو گی جو شریعت سے متصادم ہو۔ ان حدود کے اندر حالات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے ہر طرح کی قانون سازی ممکن ہو گی، مگر اس میں بھی روحِ شریعت کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔

(۲) عدلیہ اپنے عام عدالتی فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ حکمرانوں اور عام شہریوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے کا خصوصی فریضہ بھی ادا کرے گی اور اس امر کی نگرانی کرے گی کہ اربابِ اقتدار اپنے اختیارات

شریعت کے مطابق استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔ (النساء: ۵۹)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو تو اسے لوٹاؤ اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور یوم آخرت پر۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں اولی الامر کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہو، تو اس وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع ہو گا۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ایک علیحدہ ادارہ ایسا موجود ہو جو اس طرح کے تنازعات کا تصفیہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ادارہ آزاد عدلیہ ہی کا ہو سکتا ہے۔ عدلیہ ہی کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ کوئی قانون یا انتظامیہ کا کوئی حکم شریعت کے موافق ہے یا نہیں۔

(۳) مناصبِ اقتدار کو انتخاب کے ذریعے سے پُر کیا جائے گا۔ اس اصول کا ثبوت تین قرآنی آیات سے ملتا ہے۔ پہلی آیت کہتی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ (النور۔ ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے کہ وہ انہیں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے۔

یہاں خلافت کا وعدہ پوری جماعت سے کیا گیا ہے، اس کے چند افراد سے نہیں کیا گیا۔ امیرِ ریاست اُن اختیارات کو نیابتہً استعمال کرے گا جو اللہ نے مسلمانوں کی جماعت کو سونپے ہیں اور اس بنا پر درحقیقت وہ اصل خلیفہ یعنی جماعتِ مسلمین کا نائب ہو گا۔

دوسری آیت وہ ہے جسے میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمان باہم مشورے سے کام کرتے ہیں۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ، ۳۸)۔ تیسری سورۂ نساء کی آیت ۵۹ ہے جس میں اُن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ یہاں "مِنْکُم" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ اہلِ ایمان اپنے اندر سے ان لوگوں کو خود چُنیں گے جو ان کے اولی الامر ہوں۔ فی الحقیقت انتخاب کے ماسوا اُن کے تقرر کا کوئی دوسرا طریقہ تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شریعت نے کسی نسلی یا موروثی استحقاق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی قول یا عمل ایسا موجود نہیں ہے جو موروثی استحقاق، یا اصحابِ امر کے تقرر کا کوئی دوسرا طریقہ تجویز کر رہا ہو، اس لیے صرف ایک ہی قابلِ عمل صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ ہے انتخاب۔

(۴)، اسلامی ریاست کو ایک بیت المال قائم کرنا ہوگا جس میں مسلمانوں سے لی جانے والی زکوٰۃ جمع ہوگی۔ اسلامی قانون کی رُو سے یہ ایک خاص ادارہ ہے جسے اغنیاء سے مال کی ایک متعیّن مقدار لے کر غریبوں میں تقسیم کرنے کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ اسلامی ریاست شہریوں کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم کی ذمہ دار ہے۔

(۵) اسلامی ریاست کو لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے اور بہتر بنانے کے لیے بھی تمام ممکن تدابیر عمل میں لانی ہونگی۔ وہ ایسے قوانین بنائے گی جو خدا کے حرام کیے ہوئے اعمال کو جُرم قرار دیں گے، اور ایسے ادارے قائم کرے گی جن کا کام معروف کو فروغ دینا اور منکر کا استیصال کرنا ہوگا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ـ (آلِ عمران- ۱۱۰)	تم دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(۶) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو صرف ایک استثنائی صورت کے سوا باقی تمام امور میں وہی حقوق حاصل ہونگے جو خود مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے غیر مسلم اہلِ ذمّہ کے حقوق کی تصریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا وَدِمَاءُهُمْ كَدِمَائِنَا	ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور اُن کے خون ہمارے خون کی طرح ہیں۔

البتہ غیر مسلموں کو اُن کلیدی مناصب پر فائز نہیں کیا جا سکتا جو مملکت کی پالیسی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست ایک اصولی اور مقصدی ریاست ہے، اِس بنا پر اس کی پالیسی کو کنٹرول کرنے کا کام صرف اُنہی لوگوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے جو اس ریاست کے اصول و مقاصد پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر بنیادی ضروریات کی فراہمی میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ ان کے شخصی قوانین میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی تاوقتیکہ وہ شریعت اسلامی سے متصادم نہ ہوں۔ شادی بیاہ، وراثت اور ولایت وغیرہ معاملات میں ان کے اپنے ہی قوانین کا ان پر اطلاق ہوگا۔

شہریوں کے بنیادی حقوق اب ہم اُن دیوانی اور فوجداری قوانین کی طرف آتے ہیں جو اسلامی ریاست میں نافذ ہوں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اُن بنیادی حقوق پر بحث کرنی ہے جو اس کے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شریعت اسلامی چونکہ ناقابلِ تغیر و تبدل ہے اس لیے اس کے قوانین میں انسانوں کو جو حقوق عطا کیے گئے ہیں وہ بنیادی اور اساسی ہیں، کوئی مجلس قانون ساز اُن میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے بغیر کسی گہری چھان بین کے مندرجہ ذیل بنیادی حقوق معلوم کیے ہیں۔ اگر اسلامی قانون کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو مزید حقوق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے:

(۱) مذہبی آزادی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ - ۲۵۶)	دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

یہ آیت اس اصول کی صراحت کرتی ہے کہ دین میں کسی طرح بھی دخل اندازی نہیں کی جا سکتی۔ متعدد دوسری آیات بھی اسی نتیجے پر پہنچاتی ہیں:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى	اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین

يَكُونُوا مُؤْمِنِيْنَ (یونس - ۹۹) ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟

وَمَا عَلَى الرَّسُولِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ (النور - ۵۴) رسول پر اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

(۲) جان کی حفاظت کا حق: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عظیم مجمع کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"تمہاری جانیں اور تمہارے مال قیامت تک کے لیے ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح کہ حج کا یہ دن۔"

قرآن مجید میں بھی انسانی جان کی حرمت کے بارے میں متعدد آیات ملتی ہیں، مثلاً

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (المائدہ - ۳۲) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (الانعام - ۱۵۱ - بنی اسرائیل، ۳۳) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔

(۳) ملکیت کے تحفظ کا حق: اوپر ہم نے حجۃ الوداع کے جس خطبے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں مال کی حفاظت کا ذکر بھی پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ہمیں خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایک مثال ایسی ملتی ہے جس میں آپ نے قیمت کے بغیر زمین حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے آپ نے بنی نجار سے ایک زمین حاصل کرنے کا ارادہ فرمایا۔ زمین کے مالک نے بلامعاوضہ اس کی پیش کش کر دی مگر آپ نے اسے معاوضہ کے بغیر لینا قبول نہ فرمایا اور زمین معاوضہ دے کر ہی حاصل کی گئی۔

(۴) کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے قصوروں کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا: قرآن کہتا ہے:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر-۱۸) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

(۵) شخصی آزادی | حسبِ ذیل حدیث اِس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں ہر شخص آزاد ہے جب تک اس کے خلاف ایک متعین الزام ثابت نہ کر دیا جائے۔ مدینہ میں کچھ لوگوں کو حکام نے شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جس وقت خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، ایک صحابی نے عین خطبہ کے دوران میں اُٹھ کر سوال کیا کہ میرے ہمسایوں کو کن وجوہ سے پکڑا گیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو مرتبہ اُن کے اس سوال کو سن کر سکوت فرمایا۔ کوتوال شہر وہاں موجود تھا۔ جب تین مرتبہ یہ سوال اٹھائے جانے کے باوجود پولیس کے افسر نے کوئی وجہ پیش نہ کی تو آپ نے حکم صادر فرمایا کہ خَلُّوْا لَہٗ جِیْرَانَہٗ "اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو"۔ امام خَطّابی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں حبس دو ہی قسم کا ہے۔ ایک حبسِ عقوبت، یعنی یہ کہ عدالت سے سزا پا کر کوئی شخص قید کیا جائے۔ دوسرے حبسِ استظہار، یعنی ملزم کو بغرضِ تفتیش روک لیا جائے۔ یہ اس حدیث سے امام خطّابی کا استنباط ہے۔ امام ابو یوسف نے بھی یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ ایک شخص کو صرف ثابت شدہ الزامات کی بنا پر ہی قید کیا جا سکتا ہے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"اسلام میں کوئی شخص انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا"۔

۶۔ آزادیٔ رائے کا حق | اسلام نہ صرف اظہارِ رائے کی آزادی کا حق دیتا ہے بلکہ وہ اسے بہت بڑی نیکی قرار دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "سب سے افضل جہاد جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے"۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا "سیّد الشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہیں اور وہ جری شخص ہے جس نے کسی جابر اور مستبد فرمانروا کے سامنے کھڑے ہو کر اُسے نیکی کرنے اور بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کی اور اِس جُرم پر اُس فرمانروا کے ہاتھوں شہادت پائی"۔

تاریخِ اسلام کا وہ واقعہ بہت مشہور ہے جس میں ایک صحابی نے حضرت عمرؓ کے سامنے یمنی چادروں کے بارے میں ان سے باز پُرس کی تھی اور اُن سے برملا کہا تھا کہ انہوں نے دوسرے لوگوں سے زائد حصّہ

وصول کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس صحابی کو یہ کہہ کر خاموش کرنے کی قطعاً کوشش نہ کی کہ ان کی ذات پر کوئی شخصی حملہ نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ وہ اس معاملہ کی وضاحت کر دیں اور انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ مَیں نے اپنے حصّے کی چادر اپنے محترم والد کو دی ہے۔

خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ نے خارجیوں تک سے جو علانیہ ریاست کے وجود کی ضرورت کا انکار کرتے تھے، اُس وقت تک تعرض نہ کیا جب تک وہ قتل و غارت کا ارتکاب نہ کریں۔ آپ نے انہیں یہ پیغام بھیجا:

"تم جہاں چاہو رہو، ہمارے اور تمہارے درمیان شرط بس یہ ہے کہ تم خونریزی نہ کرو اور ظلم سے باز رہو۔"

ایک اور موقع پر انہوں نے خارجیوں سے فرمایا:

"جب تک تم بدنظمی اور فساد برپا نہ کرو گے ہم تمہارے خلاف جنگ نہ کریں گے۔"

مساوات اسلام انسانی مساوات پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات۔ ۱۳)	لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل دے دی تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو بےشک اللہ کے نزدیک معزز تر وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر نیکی اور پرہیزگاری کے سوا کوئی فضیلت نہیں۔"

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے قریش کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا:

"اے قومِ قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور نسب کے فخر و غرور کا خاتمہ کر دیا۔ لوگو، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے

زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی غلام ہی تم پر حاکم بنا دیا جائے۔"

آپؐ نے بارہا اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ آپؐ بھی دوسرے انسانوں ہی کی طرح ہیں، البتہ آپ کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان وجہ امتیاز صرف یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے الخلق عیال اللہ۔

۸۔ عزت کے تحفظ کا حق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (النساء-۱۴۸)	اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی توہین آمیز بات علانیہ نہیں کہی جا سکتی الّا یہ کہ کسی شخص پر ظلم ہوا ہو اور وہ اپنی مظلومی کا اظہار کرے۔ کسی الزام کا محض صحیح ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی تشہیر بھی کی جائے۔

۹۔ معروف عدالتی طریق کار کے مطابق فیصلے کا حق اسلامی قانون کی رُو سے کسی فرد کے حقوق صرف اُن شہادتوں اور بیانات کی بنا پر ہی متاثر ہو سکتے ہیں جو ایک عدالتی کارروائی کے دوران میں پیش ہوں۔ یہ مضمون ایک حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھے جس چیز کا مکلف ٹھیرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو روداد مقدمہ میرے سامنے پیش ہو اس پر فیصلہ کر دوں۔ اصل حقیقت کو تو خدا ہی جانتا ہے۔"

۱۰۔ صفائی پیش کرنے کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یمن بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں آپ نے فرمایا:

"تم اُس وقت تک کسی مقدمے کا فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق کی بات بھی اُسی طرح نہ سن لو جس طرح کہ تم نے پہلے فریق کی بات سنی تھی۔"

دیوانی قانون بنیادی حقوق کی بحث کے بعد اب ہم دیوانی قانون کو لیتے ہیں۔ میں یہاں صرف بڑی بڑی نمایاں تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہوں جو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ناگزیر ہیں۔ دوسری تبدیلیاں جو ہمیں کرنی ہونگی ان کا ذکر میں اس لیے نہیں کرتا کہ زیادہ تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

(۱) پہلی بڑی تبدیلی سُود کے معاملہ میں کرنی ہوگی۔ یہ تبدیلی کس حد تک کرنی ہوگی، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ بعض حلقوں میں یہ بحث اٹھائی جارہی ہے (جس کے دلائل کے وزن کی جانچ ابھی ہونی ہے) کہ قرآن میں لفظ ربا سے مراد صرف USURY ہے اور بینک سے جو INTERERest ملتا ہے اس پر کسی حالت میں بھی ربا کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۲) شریعت دیوانی معاملات میں کسی قانونِ میعاد کو تسلیم نہیں کرتی۔ میعاد کا قانون دراصل انفرادی معاملات میں انصاف کی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ اِس پبلک پالیسی پر مبنی ہے کہ پُرانے جھگڑوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ میں اس امر کے متعلق کوئی بیان تو نہ دوں گا کہ اسلامی ریاست کی پبلک پالیسی کیا ہوگی مگر اس معاملہ میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ قانونِ میعاد کا کوئی حصّہ اگر باقی رکھا بھی گیا تو اس کا ایک اچھا خاصا حصّہ رخصت ہو جائے گا۔ کم از کم قبضۂ مخالفانہ کو تو شریعت گوارا نہیں کرسکتی۔ اسلامی تصوّرِ حیات اس بات کو ہرگز جائز نہ رکھے گا کہ اگر ایک شخص دوسرے کی ملکیت میں مسلسل مداخلت بے جا کرتا رہے، جو بہرحال ایک ظلم ہی ہے اور عموماً اسے جرم قرار دیا جاتا ہے تو ۱۲ سال گزر جانے کے بعد اس جائداد پر اسے حقِ ملکیت حاصل ہو جائے گا۔ اسلامی ریاست سب سے زیادہ اپنے شہریوں کی اخلاقی فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھتی ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی آخرت کی ابتدائی منزل قرار دی گئی ہے۔ یہ اعتبارات لازماً ہمارے قانونی تصورات پر اثر انداز ہونگے۔ ایک اسلامی ریاست کسی ایسے قانون کی حمایت نہیں کرسکتی جس کے تحت گناہوں اور اخلاقی بُرائیوں سے منفعت بخش نتائج برآمد ہوتے ہوں۔

(۳) قانون معاہدہ (اسلامی اصطلاح میں عقود) کے اندر بھی چند تغیرات رُونما ہونگے۔ اسلام بیع غرر اور سٹہ بازی کی نوعیت کے معاہدات کو جائز نہیں رکھتا۔ اور احتکار کی اجازت بھی نہیں دیتا جس سے مراد اشیائے

ضرورت کی قیمتیں چڑھانے کی خاطر ان کو روک رکھنا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ میں تو ریاست کے قانونی نظام میں بڑی تبدیلیاں تجویز کر رہا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بات یہی ہے۔ بلاشبہ اسلام موجودہ طرزِ زندگی سے بمشکل ہی کوئی مطابقت رکھتا ہے، ______ خواہ وہ اہلِ مغرب کا طرزِ زندگی ہو یا زمانہ حال کے مسلمانوں کا۔ اگر ہمیں ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنی ہے تو ہم کو اپنا پورا نظریہ حیات تبدیل کرنا ہوگا۔ اسلام ایک منفیانہ مذہب ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اسی دنیا کی بہتری کو مقصدِ حیات بنا لیا جائے۔ مسلمان ہونے کے لیے ایک آدمی کو قربانی، ایثار اور ضبطِ نفس کی زندگی اختیار کرنی ہوگی۔

فوجداری قانون | اب ہم ان تغیرات کو لیتے ہیں جو قانونِ فوجداری میں کی جائیں گی۔

قرآن مجید میں قتل، ڈاکہ زنی، زنا، چوری اور قذف کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

قتل کی سزا موت ہے، لیکن میت کے ورثا کو معاف کرنے اور خون بہا قبول کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم تغیر ہے اور اس جرم کے معاملہ میں یہ تغیر ہمیں قانون میں کرنا ہوگا۔

ڈاکہ زنی کی سزا موت، یا ہاتھ اور پاؤں کاٹنا، یا قید ہے۔

زنا کی سزا قرآن میں ضربِ تازیانہ ہے، مگر ایک قانونی رائے یہ ہے کہ شادی شدہ اشخاص کے معاملہ میں زنا کی سزا رجم ہے۔

چوری کی سزا قطع ید خاص توجہ کی مستحق ہے۔ ایک سال سے زیادہ ہوا کہ سڈنی (آسٹریلیا) میں جب اس سزا کا ذکر کیا گیا تو اس پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور کہا گیا کہ یہ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی فعل ہے۔ اسی بنا پر میں یہاں اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے میں اس بات پر اظہارِ حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اعتراض اُن لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے جنہوں نے تاریخ کے سب سے زیادہ غیر انسانی فعل کو حق بجانب ٹھیرایا ہے، یعنی انسانوں پر جوہری ہتھیاروں کا استعمال، جس کی بدولت لاکھوں مرد، عورت، بچے، حتیٰ کہ شیر خوار معصوم تک آن کی آن میں جل کر خاک ہوگئے، اور جو موت سے بچ گئے وہ تازیست عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ یہ سب کچھ اس دعوے

کے ساتھ کیا گیا کہ انسانیت کی بھلائی اس میں مضمر تھی ، مگر اس دعوے کو ثابت کرنا آسان نہیں ہے ۔

اس واقعہ کی شدت کے بارے میں خواہ کوئی نرم رائے اختیار کرے یا سخت ، بہر حال جو لوگ بھی اسے حق بجانب ٹھیراتے ہیں وہ اس نظریے کے قائل ہو گئے ہیں کہ کسی فعل کے خلاف انسانیت ہونے کا فیصلہ خود اس فعل کی نوعیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اُس کے نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا ۔ نیز انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ کسی خلافِ انسانیت فعل کے حق بجانب ہونے کا فیصلہ کرتے وقت اُس شخص کی بے گناہی بلکہ کم سنی کا لحاظ بھی نہیں کیا جائے گا جسے اس فعل کا تختۂ مشق بنایا گیا ہو ۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر مان لی جائیں تو پھر پُورے پُورے علاقوں کی آبادیوں کو گھیر کر کیمپوں میں جمع کر دینا ، مخالفین کا صفایا کر دینا ، ایک نسل کو فنا کر دینے کی کوشش کرنا ، بدترین عذاب دینا ، اور بڑے پیمانے پر بے گناہوں کو قتل کرنا بھی حق بجانب ہی ہونا چاہیے ، جبکہ ان افعال کے مرتکبین کا دعویٰ یہ ہو کہ انہوں نے انسانی بھلائی کی خاطر یہ کام کیے ہیں ۔ یہ بات واقعی بڑی حیران کن ہے کہ بیسویں صدی کو انسانی ترقی کا ادعا تو بہت ہے مگر عملاً جو خلافِ انسانیت حرکتیں اس صدی میں ہوئی ہیں ان کا ایک فیصد بھی پچھلی صدیوں میں کبھی نہیں دیکھا گیا ۔

(باقی)

ماہنامہ ترجمان القرآن

لاہور میں اپنے اخبار فروش ، قریبی بک سٹال

یا براہ راست

" القلم " ۔ ۵۵ فلیمنگ روڈ ، لاہور سے طلب کریں